© rasailojaraid.com

باوجود اس کے کہ میرا یہ بچہ مدرسے میں پڑھ رہا ہے، خاندان اور برادری کے لوگ اور ملنے والے مدارس کے عام بچوں کی طرح اس کو جاہل نہیں سمجھتے کیونکہ ایک تو اس نے او لیول کیا ہے، دوسرے انگلش آتی ہے۔ اس لیے اگر آپ بزرگوں کی رائے اس بات کے حق میں ہو اور دینی تعلیم اور تربیت پر کوئی فرق نہ پڑے تو جدید تعلیم یافتہ علما تیار کرنے کے لیے دو نکاتی پروگرام پر عمل کیا جائے:

ا۔ پورے پاکستان کے مدارس کے ذہین بچوں کو پرائیویٹ طور پر میٹرک، انٹر، بی اے اور بی کام وغیرہ کرنے کی ترغیب دی جائے۔ اس طرح دو سے چھ سال کے عرصے میں ہزاروں گریجویٹ علما تیار ہو سکتے ہیں۔ ہماری قومی عادت صرف باتیں کرنے اور شور مچانے کی ہوگئی ہے اور سستی اور غفلت ہمارے اندر سرایت کر گئی ہے۔ اگر ہمیں مغرب اور خود اپنے ملک کے مغرب زدہ ذہنوں کا مقابلہ کرنا ہے تو خاموشی سے اس تعلیمی منصوبے پر عمل کرنا ہوگا۔

۲۔ علما حضرات کے خاندان، برادری اور ملنے والوں میں جو بچے او لیول کر رہے ہیں، وہ چونکہ میٹرک کرنے والے بچوں سے زیادہ ذہین اور مضامین کو جلد جذب کرنے اور سمجھنے کی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں، اس لیے ایسے بچوں کو خصوصی طور پر ترغیب دے کر مدارس میں علم دین کے حصول کے لیے آمادہ کرنے کی کوئی خصوصی پالیسی بنائی جائے۔ چونکہ ان بچوں کی انگلش خاص طور پر معیاری ہوتی ہے، اس لیے یہ مغربی میڈیا کا بہتر مقابلہ کر سکتے ہیں۔

پاکستان میں میٹرک، انٹر اور بی اے کرنا کوئی مشکل نہیں ہے کیونکہ لاکھوں کی تعداد میں گائیڈز، حل شدہ پرچے، نوٹس، امکانی پرچے ہر شہر کے گلی کوچے میں بک رہے ہیں۔ یہ بھی ایک عام مشاہدہ ہے کہ پاکستان میں طلبہ کی اکثریت، چاہے وہ میٹرک کی ہو یا انٹر اور بی اے کی، امتحان سے صرف ایک یا ڈیڑھ ماہ پہلے کتابیں کھولتی ہے اور کسی نہ کسی طرح رٹ رٹا کر پاس ہو جاتی ہے۔ دینی مدارس کے طلبہ کم از کم اس معیار کی ''جدید تعلیم'' تو حاصل کر ہی سکتے ہیں۔ تاہم اگر ان اسناد کو حاصل کرنے میں مدارس کے طلبہ کے اصل مقصد یعنی علوم دین کے حصول میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہو تو یقیناً ان کا جدید تعلیم سے جاہل رہنا بہتر ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔

اگر کوئی بات ناگوار گزری ہو تو معذرت چاہتی ہوں۔

دعاؤں کی طالب

والدۂ عماد

کراچی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نواب زادہ نصر اللہ خانؒ کا سانحہ ارتحال

ایک فعال سیاسی زندگی گزارنے کے بعد نواب زادہ نصر اللہ خان بھی چل بسے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ برصغیر کی کلاسیکل سیاست کے آخری چراغ تھے۔ اس اعتبار سے ان کا سانحہ ارتحال سیاست کے روایتی اسلوب کی بھی موت ہے۔ نواب زادہ نصر اللہ مرحوم نے مروج انداز سیاست کے برعکس جی ایچ کیو کو کعبہ وقبلہ نہیں بنایا بلکہ سیاسی اختلاف رکھنے والوں کو ''غدار اور ایجنٹ'' قرار دینے سے بھی ہمیشہ گریز کیا۔ ہماری رائے میں یہ ایسا طرز عمل ہے جس کے فروغ کی اشد ضرورت ہے۔

وطن عزیز کی سیاسی تاریخ گواہ ہے کہ نواب زادہ مرحوم نے سیاسی فضا کی آشفتہ سری کے باوجود سیاست کو ہی اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ ان کے کردار کا قابل تعریف پہلو یہ ہے کہ انہوں نے کاروباری سیاست نہیں کی، یعنی سیاست میں کاروباری انداز میں ''سرمایہ کاری'' نہیں کی، بلکہ انہوں نے ہمیشہ ''خرچ'' کرنے کی پالیسی ہی اپنائے رکھی۔

جہاں تک جمہوریت کے لیے نواب زادہ مرحوم کی خدمات کا تعلق ہے، ان کا احاطہ کرنے کے لیے وطن عزیز کی پچپن سالہ تاریخ کا تذکرہ کرنا پڑے گا جس کے لیے سینکڑوں صفحات درکار ہیں۔ یہاں اتنا عرض کرنا کافی ہوگا کہ اگر پاکستان کی جمہوری جدوجہد میں سے نواب زادہ مرحوم کا کردار نکال دیا جائے اور اس مفروضے کے تحت تاریخ پاکستان کی جمہوری جہت کا مطالعہ کیا جائے کہ نواب زادہ موجود نہیں ہیں تو صاف عیاں ہو جائے گا کہ اس شخصیت کی عدم موجودگی میں آمریت کو چیلنج کرنے کی روایت قائم ہی نہ ہوتی اور آج یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا کہ ملک میں اقتدار اعلیٰ پارلیمنٹ کو حاصل ہے یا جی ایچ کیو کو۔

نواب زادہ مرحوم کے بعد اب ہم پھر ایک ''تاریخی موڑ'' پر کھڑے ہیں۔ آنے والے چند سال بتائیں گے کہ آیا ہماری جمہوری جدوجہد کا مرکز ومحور ایک ہی شخصیت تھی۔ اگر ایسا ہوا تو یہ ایک المیہ ہوگا۔ یہ بات ہم اس لیے عرض کر رہے ہیں کہ ہمارے ہاں ہر کام، خواہ اس کی نوعیت کوئی بھی ہو، شخصیات کے گرد گھومتا ہے۔ نواب زادہ مرحوم کی قد آور شخصیت کی اہمیت اپنی جگہ لیکن یہ بات بہت اہم ہے کہ ان کی جاری کردہ جدوجہد کی نوعیت اداراتی ہے یا شخصی؟ ہمیں بجا طور پر توقع رکھنی چاہیے کہ نواب زادہ مرحوم کے تربیت یافتگان ان کے وسیع آدرش کو پیش نظر رکھیں گے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے رہے ہیں اور شاید آئندہ بھی کرتے رہیں گے کہ نواب زادہ مرحوم نے ہر حکومت کو ''گرانے'' میں کلیدی کردار ادا کیا۔ حکومت کے خاتمے پر نئی حکومت بننے کے بعد وہ پھر ''پرانا عمل'' شروع کر دیتے تھے اور نئی حکومت کو بھی ''گرا'' کر ہی دم لیتے تھے۔ اس طرح سیاست میں ان کے کردار پر منفی چھاپ غالب نظر آتی ہے۔ بظاہر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ جمہوریت کا وجود ہی اپوزیشن کی مرہون منت ہے لہٰذا جمہوری حکومت کی مخالفت کرنے سے خرابی نہیں پیدا ہوتی بلکہ ذمہ داری کا عنصر جنم لیتا ہے۔ ویسے بھی کسی بھی جمہوری حکومت کے تمام اقدامات سے ہر شخص کلی اتفاق نہیں کر سکتا اور یہ اپوزیشن کا ہی پلیٹ فارم ہوتا ہے جہاں سے اختلاف کا باقاعدہ اور مسلسل اظہار کیا جاتا ہے۔ باقی رہی بات آمریت کی مخالفت کی تو اس سلسلے میں نواب زادہ کے کردار پر کوئی معذرت خواہ رویہ اپنانے کی ضرورت نہیں کیونکہ جمہوریت کا بوریا بستر گول کرنے والوں کا اپنا بوریا بستر بھی ہر صورت میں گول ہی ہونا چاہیے۔

بہر حال نواب زادہ مرحوم کے سیاسی قد کاٹھ اور ان کی خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے برملا کہا جا سکتا ہے کہ ان کی وفات نے ایک عظیم خلا پیدا کر دیا ہے۔ اب بھلا

''وقت سے کون کہے، یار، ذرا آہستہ
گر نہیں وصل تو یہ خواب رفاقت ہی ذرا دیر رہے،
وقفہ خواب کے پابند ہیں
جب تک ہم ہیں!!
یہ جو ٹوٹا تو بکھر جائیں گے سارے منظر
(تیرگی زاد کو سورج سے فنا کی تعلیم)
ہست اور نیست کے مابین اگر
خواب پل نہ رہے
کچھ نہ رہے!
وقت سے کون کہے،
یار، ذرا آہستہ!''

جی ہاں، ہم نواب زادہ مرحوم کو ''وقفہ خواب'' سے تعبیر کر سکتے ہیں، خوابِ رفاقتِ جمہوریت۔

اگرچہ وطن عزیز میں جمہوریت صحیح معنوں میں کبھی مستحکم نہیں ہو سکی کہ ہر بار اس کلی کو کھلنے سے پہلے ہی مسل دیا گیا اور پھر کہا گیا کہ اس کے تو ''تخم'' میں ہی خامی ہے، لیکن نواب زادہ مرحوم نے جمہوریت کے تخم پر بے اعتباری کو کبھی

© rasailojaraid.com